بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

وہ لوگ جنہوں نے انسانی فطرت کا ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے پوری طرح آشنا ہیں کہ انسان جب کوئی کام کرتا ہے — خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا — اُس کے لیے وجہِ جواز ضرور ڈھونڈتا ہے۔ بلکہ جو کام جس قدر زیادہ غلط ہوتا ہے اُسی نسبت سے انسان اُسے صحیح اور برحق دکھانے کے لیے جد وجہد کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اپنے فعل کو جائز ٹھہرانے کے لیے انسان جو دلائل پیش کرے وہ دوسروں کے لیے لازمی طور پر قابلِ قبول بھی ہوں، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس معاملے میں انسان کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نئی گمراہیوں کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے نظریات اور نئے نئے نظامہائے اخلاق بھی وضع ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب انگریز نے مشرقی ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کا عزم کیا تو اُس نے اپنے اس ظالمانہ طرزِ عمل کو سفید فام کی ذمہ داری (WHITEMAN'S BURDEN) سے تعبیر کیا۔ پھر جب جرمنی کے نازیوں نے کمزور اقوام پر دستِ تظلم دراز کرنا چاہا تو فوراً ہی نسلی تفوّق ایسے غیر انسانی نظریے کی تشکیل کر لی۔ اسی طرح جب اہلِ یورپ پر سے مذہب اور اخلاق کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور انہوں نے خداوند تعالیٰ کی پرستش کی بجائے حرص و آز کی غلامی اختیار کی تو اپنے اس افسوسناک انحطاط کو چھپانے کے لیے انہوں نے رجوع الی الفطرت (BACK TO NATURE) کا سہارا لیا۔ باطل نظریات کی اس لمبی فہرست میں ایک نظریہ "معاشرتی ارتقاء"[۱] کا بھی ہے۔ یہ نظریہ بظاہر بڑا دلکش اور دلفریب ہے اور سطح بین آنکھوں کو یہ بہت زیادہ معقول اور صحیح بھی نظر آتا ہے مگر انسانیت کو گمراہی پر مطمئن کرنے کے معاملے میں جتنا شرمناک کھیل اس نظریہ نے کھیلا ہے کسی دوسرے نے نہیں کھیلا۔

---

[۱] اس نظریہ پر تفصیلی بحث کے لیے راقم الحروف کی کتاب "انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام" ملاحظہ فرمائیں۔

فنی اصطلاحات اور پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت خود بخود تکمیل اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کا ہر قدم لازماً آگے کی طرف ہی اٹھتا ہے آج انسانیت تہذیب و شائستگی کی جس اونچی سطح پر ہے اُس سے پیشتر یہ مقامِ بلند اُسے کبھی بھی نصیب نہیں ہوا تھا اور اس اعتبار سے ہر آنے والی حالت گزری ہوئی حالتوں کے مقابلے میں یقینی طور پر ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے۔

اس نظریہ میں جو فکری لغزشیں اور منطقی مغالطے موجود ہیں اُن پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آخر یہ نظریہ وضع کیوں کیا گیا؟

اہلِ یورپ نے جس وقت بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے کام لینا شروع کیا تو اس سے اُن کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں ایک زبردست انقلاب برپا ہوا اور بے شمار نئے مسائل اُبھر کر اُن کے سامنے آئے مگر بدقسمتی سے اہلِ یورپ اُس وقت جس مذہب سے آشنا تھے اُس کے اندر یہ قوت اور توانائی موجود نہ تھی کہ وہ ان بدلے ہوئے حالات میں ان کی راہنمائی کا فرض سرانجام دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپین قومیں ایک شدید ذہنی بحران میں مبتلا ہوئیں۔ وہ کچھ مدت تک تو اسی حالت میں پڑی رہیں۔ مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اُن کا مذہب اُن کے اجتماعی مسائل حل کرنے سے قاصر ہے تو انہوں نے اس مذہب کو رہوار کی گرد سمجھتے ہوئے پیچھے چھوڑ دیا اور خود اپنے ناخنِ عقل سے ان الجھنوں کو سلجھانا شروع کیا۔

انسان اگر محض حیوان ہوتا تو یہ عین ممکن تھا کہ وہ ترکِ مذہب کو اپنے لیے ہر حالت میں ایک فالِ نیک ہی خیال کرتا اور مذہبی بندھن توڑ دینے کے بعد اُس کے دل میں کبھی یہ آرزو پیدا نہ ہوتی کہ وہ اُن کی طرف پلٹ کر دیکھے۔ لیکن چونکہ انسان کی زندگی میں حیوانی عنصر سے کہیں زیادہ روحانی عنصر بھی شامل ہے اس لیے وہ مادی ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود اپنی زندگی میں ایک زبردست خلا محسوس

کرتا ہے اور اس بات کا آرزومند ہے کہ کوئی فلسفۂ حیات اُسے یہ یقین دلا دے کہ اُس کی زندگی کا رُخ تکمیل کی طرف ہے۔ چنانچہ اہلِ یورپ بھی مدتوں سے اسی خلش اور اضطراب سے دوچار تھے اور کسی ایسے فلسفے کی جستجو میں تھے جو اسے دُور کر سکتا ہو۔

اس نظریہ کی تشکیل کی دوسری وجہ خود مادیت کی ناکامی بھی ہے۔ مادی فلسفۂ حیات نے اگرچہ یورپین قوموں کو دنیاوی مال و متاع سے مالا مال کر دیا ہے۔ ان کے اندر حرکت اور حرارت پیدا کی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ تسخیر کائنات کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئی ہیں۔ مگر ابھی تک اُن کے سامنے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کو وہ ابتدائی طور پر بھی حل نہیں کر سکیں۔ مثلاً فرد اور اجتماع کا رشتہ کیا ہونا چاہیے۔ اگر وہ فرد کو اہمیت دیتی ہیں تو سرمایہ دارانہ نظام اپنی ساری فہرمانیوں کے ساتھ اُن پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اجتماعیت پر زور دینا شروع کرتی ہیں تو پھر اُن کی انفرادی زندگی ایک ناقابلِ برداشت عذاب کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ یہ الجھن انہیں صرف زندگی کے ایک شعبے ہی میں درپیش نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں پیش آ رہی ہے۔ کارلائل نے اسی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہم آج جس نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں اُس میں ہر انسان سخت ہراساں ہے۔ کچھ لوگ اس لیے چیخ پکار کرتے ہیں کہ اُن کی بیس ہزار قمیصیں بک نہیں پاتیں اور بیس ہزار انسان اس لیے آہ و فغاں بلند کر رہے ہیں کہ انہیں تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں ملتا۔

ان پریشانیوں کے سامنے سرنگوں ہونے سے اگر کوئی نظریہ انسان کو بچا سکتا ہے تو صرف یہی ہے کہ اُس کے دل میں اس خیال کو راسخ کیا جائے کہ وہ بہر حال ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کا ہر قدم تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ مسائل جنہیں وہ لاینحل سمجھ کر پریشان ہو رہا ہے وہ مادی ترقی کے ساتھ خود بخود ہی حل ہو جائیں گے اور مادی ترقی کی برق رفتاری انسانیت کو ایک صحیح نصب العین سے بالآخر ہمکنار کر دے گی۔ وہ آج جس دور سے گزر رہا ہے وہ دَور اُن سارے ادوار سے ہر لحاظ سے بہتر ہے جن میں اُن کے آبا و اجداد نے زندگیاں گزاری تھیں اور زمانہ ہر نئی کروٹ کے ساتھ انسانیت کی سطح

بلند کرتا چلا جا رہا ہے اور وہ اس طرح ہر لحظہ بالکل غیر محسوس طور پر حق اور صداقت کے قریب پہنچ رہا ہے۔

اہلِ یورپ کے اندر خود اعتمادی کی اگر کوئی رمق موجود ہے تو وہ اسی نظریہ کی رہینِ منت ہے۔ اس نظریہ کی جھلکیاں اُن کے پورے ادب اور فلسفے میں دکھائی دیتی ہیں۔ انگلستان کے مشہور شعراء ٹینی سن اور رابرٹ براؤننگ کے پورے دواوین میں یہ نظریہ بنیادی فکر کے طور پر کارفرما ہے۔ ہیگل کا سارا فلسفہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ ہیگل انسانیت کی اس ناگزیر ترقی کو جدلی عمل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء دراصل اضداد کے ظہور، تصادم اور پھر امتزاج و مصالحت سے واقع ہوتا ہے۔ تاریخِ انسانی کا ہر دَور اپنی جگہ ایک وحدت، ایک کُل ہے۔ اس دور میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے مثلاً سیاسی، معاشی اور تمدنی ایک خاص مرتبے پر ہوتے ہیں۔ ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ پھر جب روح مطلق اپنی فطری رفتار کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے، تو خود ایک تہذیب کے مختلف شعبوں میں ایک اختلال سا پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جلد ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ مدت برسرِ پیکار رہنے کے بعد بالآخر تغیر کے طالبوں اور حالتِ سابقہ کے حامیوں میں صلح ہو جاتی ہے، دونوں گروہ اپنے میں سے کمزور عناصر چھانٹ کر علیحدہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ایک نئی تہذیبی وحدت کو جنم دیتے ہیں جو دونوں گروہوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پہلی وحدت سے کہیں زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر آنے والا دور پہلے دَور سے لازماً افضل و اکمل ہوتا ہے۔

مارکس روحِ مطلق کی جگہ معاشی محرکات کو بنیاد بنا کر انسانیت کے تہذیبی ارتقاء کو ثابت کرتا ہے۔ ہیگل کے نزدیک اگر زمانہ روحِ مطلق کے اشارہ پر مسلسل ترقی کرتا ہے تو مارکس کے نظریہ کے مطابق معاشی محرکات انسانی ترقی کے ضامن ہیں۔ سب سے پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اس کا اثر براہِ راست اسبابِ زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات پر پڑتا ہے۔ اس سے زندگی کی ساری

اقدار از خود بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام معرض وجود میں آتا ہے۔ اب ان دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدلی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوتی ہے، بالآخر وہ صلح پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا نظام پہلے نظاموں سے زیادہ صحت مند اور صالح ہوگا۔

ہم یہاں محض طوالت کے خوف سے صرف انہی دو مفکرین کے خیالات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ اس نظریہ کو علمی اور فکری بنیادیں فراہم کرنے کے لیے تو فلاسفہ اور مفکرین کی ایک پوری فوج موجود ہے۔ میکیاویلی، ڈاروِن، ارنسٹ ہیکل اور کارل پیرسن کے افکار و نظریات سب اسی معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کے مؤید ہیں۔

یورپ اگر اس باطل نظریہ کو اپناتا ہے تو اس کے پاس بہر حال اس کی کچھ بنیاد اور اساس موجود ہے مگر اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری اپنی ملت کے بعض کرم فرما اس نظریہ سے مرعوب ہو کر دانستہ یا نادانستہ اپنے تہذیبی ارتقاء کے بارے میں اسی قسم کی باتیں کہہ رہے ہیں جو معاشرتی ارتقاء کا علمبردار کرتا ہے۔ حال ہی میں ایک صاحب نے بڑے طنطنے کے ساتھ ایک مقالہ لکھا ہے جس میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق حیوانات آہستہ آہستہ ترقی کر کے انسانی شکل اختیار کر لیتے ہیں یا جس طرح ایک بیج غیر محسوس طور پر برومند ہو کر ایک تناور درخت بن جاتا ہے اس طرح اسلام بھی نہایت مدھم رفتار کے ساتھ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ البتہ جب کبھی انسانوں کی کوئی جماعت اسلام کی ابدی سچائیوں کو قبول کر کے انہیں اپنے ہاں عملاً نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو پھر اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر خارجی تحریک کمزور پڑ جائے تو پھر اسلام کی یہ جوئے رواں اپنی سابقہ رفتار اختیار کر لیتی ہے۔ انسانی جماعت کی تائید و رفاقت سے جو تبدیلیاں انقلابی طور پر معاشرہ میں ظاہر ہوتی ہیں انہیں یہ صاحب ناگہانی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ممکن ہے اسلام کے تہذیبی ارتقاء کی اس میکانکی تعبیر کو بعض سطح بین لوگ بہت بڑی ملّی خدمت خیال کریں لیکن اگر اس تعبیر کا ذرا دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس تعبیر کے قبول کر لینے کے بعد اسلام کی ساری بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

جب ہم اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ایک ازلی و ابدی دین ہے تو اس دعوے میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بنیادی حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ انسانی فطرت زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود ایک ہی رہتی ہے اور آج کے انسان اور ازمنۂ وسطیٰ کے انسان میں فطرت کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو پھر مذہب، اخلاق، تاریخ اور قانونی نظائر سب بیکار ہوتے اور ان سے نہ کوئی سبق حاصل ہو سکتا اور نہ ہی رہنمائی لی جا سکتی۔ ان سب چیزوں کا مفید اور کارآمد ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ گزشتہ زمانہ کا انسان اور زمانۂ حال کا انسان فطری لحاظ سے ایک ہی ہے لیکن اگر اس سے انکار کر دیا جائے تو پھر ان علوم کا مطالعہ بالکل فضول اور وقت کے سیاسی یا تمدنی مسائل میں ان کی عدالت سے فیصلہ طلب کرنا بیکاری کا مشغلہ بن کر رہ جاتا ہے بلکہ ایسی حالت میں تو یہ بھی ناممکن ہے کہ تاریخی ارتقاء کی اس منزل پر ہم ان انسانوں کے اجتماعی اعمال و محرکات اور طرزِ عمل کو سمجھ سکیں یا ان کی توجیہ کر سکیں جو ہم سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کی ذہنی سطح ہم سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ کیونکہ جب ہم اپنے ذہن اور اپنی زندگی پر وہ تمام حالتیں طاری نہ کر لیں جن کے اندر سے زمانہ گزشتہ کا انسان گزرا تھا۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم اُس کے تمدن یا معاشرت سے کوئی مفید سبق حاصل کر سکیں۔ ہم جو ماضی کے واقعات اور تجربات سے ہر آن فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں تو وہ صرف اسی بنیاد پر ہے کہ ہمارے موجودہ ذہن اور ہمارے محرکات اور نفسی اعمال اُن انسانوں کی ذہنی کیفیات کے ساتھ گوناگوں یگانگت اور مماثلت رکھتے ہیں جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ہم بڑی کامیابی کے ساتھ اُن حالتوں کو اپنے اوپر طاری کر سکتے ہیں جو اُن پر ماضی میں طاری ہوتی تھیں۔ غور کیجیے کہ جو محرکات آج انسان کو جنگ و صلح، دوستی و دشمنی تعمیر و تخریب پر ابھارتے ہیں وہ اُن محرکات سے کس طرح مختلف تھے جنہوں نے عہدِ عتیق میں انسانوں کو

سرگرم عمل کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی بنیادی فطرت آج بھی وہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال پہلے تھی اور اسی وجہ سے اسلام کو اس بات کا استحقاق ہے کہ وہ نوعِ بشری کے ہر فرد سے — خواہ اُس کا تعلق ساتویں صدی سے تھا یا وہ آج سے چار صدیاں بعد دنیا میں جنم لینے والا ہے — غیر مشروط پیروی کا مطالبہ کرے۔ اگر اسلامی تعلیمات ایک خاص دَور کی ذہنی فضا میں ہی صحیح طور پر سمجھ میں آسکتی ہیں تو پھر معاذ اللہ خالقِ کائنات کا یہ دعویٰ صرف ایک ٹرا ابول بن کر رہ جاتا ہے کہ اسلام ہی ایک ابدی نظامِ حیات ہے۔

معاملہ پھر یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ خداوند تعالیٰ نے جزا اور سزا کے جو تصوّرات ہمیں دیئے ہیں وہ بھی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک انسان پھر بڑی آسانی کے ساتھ خداوند تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے کہ حضور، مجھے جس دَور میں پیدا کیا گیا تھا اُس میں میری ذہنی سطح اتنی بلند نہ تھی کہ وہ آپ کے احکام اور فرامین تک رسائی حاصل کر سکتی۔ لہٰذا آپ مجھے سزا دینے میں قطعاً حق بجانب نہ ہوں گے۔ آپ نے خود ہی میرے لیے ایک ایسا دَور منتخب فرمایا جس میں رہتے ہوئے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں آپ کے اس دین کو پورے شرح صدر کے ساتھ سمجھ سکتا جو ابھی خود ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اب اگر آپ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ ہم پورے دین کو اپنائیں تو براہِ کرم ہمیں ازلی زندگی عطا کیجیے تاکہ تکمیلِ دین کے ساتھ ساتھ ہمارا ذہنی ارتقا بھی مسلسل جاری رہے اور اسے سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس قسم کا موقع بہم پہنچائے بغیر اگر آپ ہماری کوتاہیوں پر گرفت کرتے ہیں تو یہ آپ کی زیادتی ہے جو آپ جیسی عادل ذات کو زیب نہیں دیتی۔

ہمارے نزدیک اس فلسفہ کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اسے قبول کر لینے کے بعد ہمارے دلوں میں اس دَور کی وقعت کم ہو جاتی ہے جسے ہم نوعِ بشری کا ایک روشن ترین دَور کہتے ہیں۔ اور جو نہ صرف ہمارے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے جس کے متعلق ہم یہ ایمان رکھتے

ہیں کہ اسلامی تعلیمات اسی با برکت عہد میں احسن اور اکمل طریق سے عمل کے سانچے میں ڈھلی ہیں۔ قافلہ انسانیت ہدایت اور رہنمائی کے لیے ابدالآباد تک اسی دَور کی روشنی کا محتاج ہے۔ اس دور سے صرفِ نظر کر کے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی جادۂ مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآن پاک کا یہ مژدہ جانفزا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

معاذاللہ کوئی شاعرانہ ترنگ نہیں بلکہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ وہ خدا جس نے قرآن مجید نازل فرما کر تکمیلِ دین کی بشارت دی ہے، اُسی نے حضورِ سرورِ دوعالم خاتم الانبیاء کے ذریعہ اس بات کا بھی التزام فرمایا کہ دین اپنی مکمل ترین شکل میں اس دنیا میں بالفعل نافذ کر کے بھی دکھا دیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کو اس کی عملی تعبیر میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئے۔

غور کیجیے اگر یہ دین اُس دَور کی انسانی فطرت سے نامانوس ہوتا تو حضور کے جاں نثار فدائی اسے کس طرح اپنا سکتے تھے۔ یہ دین اُن کے دلوں میں اترنے کی بجائے اُس وقت کا انتظار کرتا جب انسانیت ترقی کے سارے مراحل طے کر کے آخری منزل پر پہنچ جاتی۔ اگر معاشرتی ارتقاء کے اس احمقانہ نظریہ کو صحیح مان لیا جائے تو پھر تاریخ انسانی کا سب سے درخشندہ دَور وہ نہیں قرار پاتا جس میں حضور اور اُن کے جلیل القدر اصحاب نے اپنی پاکیزہ اور مقدس زندگیاں بسر کی ہیں بلکہ وہ دور ٹھہرتا ہے جب انسانیت ارتقاء کی ساری منزلیں نہایت کامیابی کے ساتھ طے کرلے۔

پھر اس نظریہ کو اپنانے کے بعد اُس دَورِ سعید کے بارے میں انسانی ذہن پر بالکل فطری طور پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقائے کار کی خدمات خواہ نوعیت کے اعتبار سے کتنی ہی اہم ہوں، مگر ان کی مخلصانہ جدوجہد سے دنیا میں جو انقلاب برپا ہوا وہ سراسر مصنوعی تھا۔ اُس دَور کی ذہنی سطح چونکہ آج کے مقابلے میں پست تھی اس لیے وہ اسلام کے انقلابی پیغام کو کما حقہٗ سمجھنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اور کیا وہ اگرچہ بالکل صحیح اور درست تھا مگر وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھا بلکہ انہوں نے اُس انسانیت کو جو پرائمری کی تعلیم کے قابل تھی ایم۔ اے کے درس دینے شروع کر دیئے اور اسی وجہ سے عوام الناس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشاداتِ عالیہ کو پوری طرح سمجھ نہ سکے اور اُن کی مخالفت شروع کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور سرور کائنات نے حسنِ تلقین، جوشِ عمل اور بہتر نظامِ تعلیم و تربیت کے ذریعے کچھ لوگوں کو تعلیماتِ الٰہی کے قبول کرنے پر فکری طور پر آمادہ کر لیا تھا مگر عام انسانیت ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ تھی۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں حضورؐ اور آپ کے جلیل القدر اصحاب کی کارگزاریوں کی اس نظریہ کی رُو سے اصل حقیقت، جو ہمارے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ معاشرتی ارتقاء کے اس باطل نظریہ کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔

آئیے اب اس نظریہ کے مضمرات کا دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی جائزہ لیں۔

اس نظریہ کو جب کوئی فرد قبول کر لیتا ہے تو قدرتی طور پر اُس کے ذہن میں یہ احساس پرورش پاتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی پوری پوری سعی کی مگر وہ معاذاللہ اتمامِ حجت نہ کر سکے: جب ایک دَور کے لوگوں میں یہ ذہنی صلاحیت ہی مفقود ہو کہ وہ ایک اعلیٰ اور ارفع نظامِ حیات کو سمجھ سکیں تو پھر اُن پر اتمامِ حجت کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ بیچارے اگر انکار کر دیتے ہیں تو ایسا کرنے پر وہ فطری طور پر مجبور ہیں لہٰذا وہ خدا اور خلق کی نگاہ میں قطعاً مجرم نہیں۔ قدرت نے خود ہی ان کی راہ میں بہت سے موانع پیدا کر دیئے ہیں۔ اس لیے کفر و عصیان کی ذمّہ داری کسی صورت میں بھی اُن پر عائد نہیں ہوتی بلکہ خود فطرت پر عائد ہوتی ہے جس نے اُن کے اندر یہ ذہنی صلاحیت ہی پیدا نہ کی کہ وہ حق کو شرحِ صدر کے ساتھ قبول کر سکیں۔

استدلال کے اسی طریق کو اگر آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہم جو مختلف افکار و اقدار پر نیک و بد، محمود و مذموم یا حق و باطل کا اطلاق کرتے ہیں یہ بھی ہماری صریح زیادتی ہے۔ جب ایک شخص ایک مخصوص دَور کے ذہنی افلاس کی وجہ سے حق کو پہچان نہیں پاتا تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے۔ وہ بیچارا تو اس معاملے میں مجبورِ محض ہے لہٰذا اُس کے کسی قول یا فعل کو صحیح یا غلط کس طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ وہ شخص اپنے دَور کی جتنی جزوی صداقتیں سمجھ سکتا ہے وہ صرف انہیں قبول

کرنے کا ہی مکلف ہے۔ ان سے بڑھ کر اُس شخص سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ پورے کے پورے دین کو اپنا لے اس نقطۂ نظر کے مطابق صریح ظلم ہے۔ جب انسان کی ذہنیت اور سیرت کی تشکیل میں عصری سطح ہی کو اصل اہمیت حاصل ہے جس کے تعین کرنے میں اسے کسی طرح کا اختیار یا قدرت حاصل نہیں تو پھر اُس کے افکار و اعمال کی ذمہ داری اس پر کیونکر ڈالی جا سکتی ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے، یا جو کچھ کرتا ہے وہ سب کچھ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کے تحت کر رہا ہے۔ ہم ایک شخص کو گمراہ صرف اسی صورت میں کہہ سکتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ اُس کے اندر حق کو قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود تھی مگر اُس نے محض تعصب، ہٹ دھرمی اور ضد کی بنا پر صحیح روش کو اختیار کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ عصری تقاضوں کے دباؤ سے سرزد ہو رہا ہے تو پھر وہ شخص تو بہر حال بے قصور رہے۔

اس کے علاوہ اگر کوئی شخص معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو صحیح اور درست مانتا ہے تو پھر وہ حضورؐ کے افکار و اعمال کو کبھی بھی دین کے اندر حجت تسلیم نہیں کر سکتا۔ حضورؐ کا جسمانی تعلق تاریخِ انسانی کے ایک ایسے دَور سے تھا جس میں انسانیت کی ذہنی سطح آج کے مقابلے میں کچھ زیادہ بلند نہ تھی اس لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے عہد کے مخصوص حالات میں تو بالکل صحیح اور درست ہے مگر آج جبکہ انسان فکری اعتبار سے ماضی کی بہ نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے اسے کیونکر دین کے اندر آخری سند کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے سنتِ رسولؐ محض ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتی ہے جس سے کتابوں کے صفحات کو تو مزین کیا جا سکتا ہے مگر زندگی کے اہم معاملات میں اُس سے کوئی رہنمائی نہیں لی جا سکتی۔ جب یہ فرض کر لیا جائے کہ جس دَور میں حضورؐ پیدا ہوئے اُس وقت کی ذہنی سطح آج کے مقابلے میں پست تھی تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے جس طریق سے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی وہ طریقہ آج کے روشن دَور میں کچھ مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا۔ وہ تعلیم جو ایک

دَور کے فکری تقاضوں کو پورا کرتی ہو اُس دور کے خاتمہ کے بعد خود بخود ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ چونکہ انسان کی ذہنی سطح مسلسل بلند ہو رہی ہے اس لیے ہر دَور کے لیے اسوۂ حسنہ بھی الگ ہی ہونا چاہیے۔ حضورؐ کا اسوہ درخشندہ و تابندہ ہی سہی مگر وہ عہدِ حاضر کے عصری تقاضوں میں کچھ رہنمائی نہیں دے سکتا۔ چنانچہ دیکھیے کہ جو لوگ معاشرتی ارتقاء کے اس فلسفہ پر ایمان رکھتے ہیں ان میں سنت رسولؐ اور آثار صحابہ سے بیزاری کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک دنیا کا ہر اصول اضافی ہے۔

یہ اربابِ علم و فکر اپنی ساری فہم و فراست کے باوجود اس سادہ سی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان ذہنی لحاظ سے مسلسل بلندی کی طرف جا رہا ہے اور ہر آنے والے دور کی ذہنی سطح پہلے ادوار کے مقابلے میں لازمی طور پر بلند ہوتی ہے، تو پھر ماضی کے سارے تجربات ہمارے لیے بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ تجربہ کا سارا مواد گزشتہ واقعات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر انسانیت کے وہ تجربات اور اُن سے اخذ کردہ نتائج جو اُس نے ناقص ذہن کے ساتھ حاصل کیے ہیں وہ ارفع و اعلیٰ ذہن کے لیے کسی طرح بھی مفید اور کار آمد ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس پر بالعموم دو قسم کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ جو لوگ دین کو نہیں مانتے وہ یہ کہتے ہیں کہ نئے حالات میں عقل ہماری مدد پر آتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عقل خود کیا چیز ہے۔ وہ بھی آخر تجربہ کا ایک وظیفہ ہے کیونکہ اسے جو کچھ ملتا ہے وہ تجربہ ہی سے ملتا ہے۔

دوسرا گروہ، جو دین کو کسی حد تک مانتا ہے، یہ کہتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے لیے تنہا عقل کافی نہیں بلکہ انسان اس زندگی کو ٹھیک طور پر گزارنے کے لیے وحی الٰہی کا محتاج ہے۔ مگر یہاں ایک دوسری نوعیت کی الجھن پیش آتی ہے۔ وحی الٰہی اگر محض افکار و تصورات کا مجموعہ ہوتی تو اس جواب کو تسلیم کرنے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہ آتی۔ مگر یہاں معاملہ یہ ہے کہ یہ وحیٔ الٰہی جو قرآن مجید میں محفوظ ہے، ایک دین، ایک ضابطۂ حیات ہے جو اپنے ماننے والوں سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُسے عملی زندگی میں نافذ بھی کیا جائے اور یہ طریقِ نفاذ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ خود وحی۔ وحی کو اگر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

میں محفوظ فرمایا ہے تو اس کے نفاذ کے طریقوں کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ توضیح فرمائی ہے۔ ہمارے لیے یہ وحی جس قدر ضروری ہے اتنا ہی ضروری وہ طریقہ بھی ہے جس کے مطابق یہ وحی زمان و مکان کی لوح پر ثبت کی جانی چاہیے۔

آپ ذرا غور کریں کہ اس معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو مان کر ہمیں کس قسم کے منطقی مغالطوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنت کو پس پشت ڈال کر ہماری عقل صرف قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو یہ بہت بڑی خود فریبی ہے۔ عقل نے تو سارا مواد ماضی کے تجربات سے حاصل کیا ہے اور ماضی کے تجربات اس نظریہ کی رُو سے بالکل بیکار ہیں کیونکہ جس وقت یہ تجربات کیے گئے تھے اُس وقت انسان کی ذہنی حالت اور تھی اور آج اُس سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے ماضی کے تجربات زمانۂ حال کے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

لیکن اگر اس کے برعکس یہ کہا جائے کہ قرآن مجید سے صحیح رہنمائی سنت کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے تو پھر معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کا خود بخود ابطال ہو جاتا ہے۔ سنّت کو حجت ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس حقیقت کو بھی تسلیم کریں کہ اُس دور کی ذہنی سطح جس میں حضور تشریف لائے اور آج کل کی ذہنی سطح میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ انسان کی بحیثیت انسان کے بہترین اندازے کے مطابق تخلیق کی گئی ہے۔ اس کی عقل کا دائرۂ کار بلاشبہ بدلتا رہتا ہے مگر خود اس میں قطعاً کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ انسان کا تعلق خواہ چھٹی صدی سے ہو یا بیسویں صدی سے، خدا کا دین ہر دور میں اُس سے غیر مشروط وفاداری اور اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے مگر انسان کو اس امر کا بھی اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسے قبول کرے اور اگر چاہے تو اس سے انکار کر دے۔ تاریخ کی مختلف کروٹیں اُسے حق و صداقت کے قریب تو لا سکتی ہیں مگر جبر کے ساتھ اس بات کے لیے آمادہ نہیں کر سکتیں کہ وہ اسے لازمی طور پر اپنا بھی لے۔ اس کا انحصار خارجی حالات پر نہیں بلکہ اس کے داخلی احساسات پر ہے۔

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ ... ہم نے اسے راستہ دکھلا دیا ہے۔ چاہے تو وہ

اِمَّا كَفُوْرًا — شکر گزار ہو اور چاہے تو انکار کردے۔

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ — جو کوئی چاہے ایمان لے آئے اور جو کوئی چاہے

فَلْيَكْفُرْ۔ — انکار کردے۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم بات ختم کرنے سے پیشتر اس امر کی بھی صراحت کردیں کہ دوسرے نظامہائے حیات میں اسلامی تعلیمات کی کچھ جھلکیاں دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ دنیا اضطراری طور پر اسلام کی طرف بڑھ رہی ہے محض فریب خیال ہے۔ آج کی غیر مسلم قومیں اسلام سے اتنی ہی دور ہیں جتنی کہ دس صدیاں پیشتر کی کافر قومیں تھیں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ دورِ جدید نے اسلام کے بعض اصولوں کو اپنا لیا ہے مثلاً انسانیت نے اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے کا ڈھنگ سیکھا ہے، غلامی کا خاتمہ ہوا ہے، نسلی تفوّق کی جڑ کٹ گئی ہے، جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی سے انسانیت کو نجات حاصل ہوئی ہے اور اب دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں نے قومی اور نسلی تعصبات کو پسِ پشت ڈال کر انسانیت کی وسیع تر بنیادوں پر نظامِ حیات کی تشکیل کرنا شروع کی ہے، تو ان تبدیلیوں کے بارے میں بھی صرف یہی کہا جا سکتا ہے:

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

کیا روس میں جو اس وقت دنیا کی ایک زبردست سیاسی اور معاشی قوت ہے، سارے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں، الجیریا میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، اور کوریا اور جاپان میں ابھی چند ہی دن پہلے جو کچھ ہوا تھا، انہیں دیکھ کر کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اب انسان نے غلامی کو ایک لعنت سمجھ کر اُسے ترک کر دیا ہے۔ امریکہ میں جو انسانیت سوز سلوک سیاہ فام لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے کیا اُسے نسلی تفوّق کے خاتمہ کی دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ مغرب کی استعمار پسند قوموں نے مشرق کی بے سروسامان اقوام کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے اور جو اب بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے، کیا اس کو جانتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب انسانیت نے جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی کا گلا گھونٹ

دیا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جس قسم کی ہولناک تیاریاں کر رہی ہیں کیا وہ سب کچھ انسانیت کی خیر خواہی کے جذبہ سے کیا جا رہا ہے۔ یہ سب فتنہ سامانیاں اور ہلاکت خیزیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ اسلام کے باغی آج بھی فطرت کے اعتبار سے اُسی مقام پر ہیں جس پر کہ چودہ سو سال پیشتر تھے۔ ظلم و استبداد کے محض چولے بدلنے سے ظلم و استبداد ختم نہیں ہوتا۔ دیدۂ بینا ہو تو اُسے فوراً پہچانا جا سکتا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

پھر اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ غیر اسلامی نظامہائے حیات میں اسلام کے چند اجزا کا موجود ہونا صرف ہمارے اس دور کی خصوصیت نہیں۔ دنیا نے آج تک کوئی ایسا نظامِ حیات مرتب نہیں کیا جو اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی ہو۔ اسلام ایک ازلی و ابدی صداقت ہے اس لیے کسی بھی نظام کے قیام کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ اُس میں کچھ اجزا حق و صداقت کے بھی شامل کر لیے جائیں خالص باطل تو ایک لمحہ کے لیے بھی دنیا میں چل نہیں سکتا۔ جس طرح اسلامی تعلیمات کے کچھ اجزا آج ہمیں غیر اسلامی نظاموں میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ازمنۂ وسطیٰ کے قبائلی نظام میں بھی انہیں کامیابی کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے۔

کسی نظامِ حیات کا اصل جوہر اُس کے اجزا نہیں ہوتے بلکہ وہ رشتۂ تناسب ہے جس کے تحت ان اجزاء کو جوڑ کر ایک نظام کی تشکیل کی جاتی ہے۔ کافرانہ نظام کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ حق و صداقت سے بالکل تہی دامن ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اُس نظامِ حیات میں مختلف شعبوں کو جس طرح مرتب کیا گیا ہے اُن میں الحاد ایک بنیادی تصور کے طور پر شامل ہے۔ دنیا کا ہر نظام چونکہ انسان سے بحث کرتا ہے اس لیے مختلف نظامہائے حیات میں بعض چیزوں کا اشتراک ایک فطری سی چیز ہے لیکن اس اشتراک سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ وہ روح کے اعتبار سے ایک ہی ہیں بہت بڑی غلط فہمی ہے

اسلام کو کفر سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ اُس نے زندگی کے سارے شعبوں کو ایمان باللہ کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ اور یہ بنیادی تصور ہی اس نظام کی جان ہے۔ آپ انسانی چہروں پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو ہر چہرہ دوسرے سے مختلف نظر آتا ہے۔ حالانکہ اعضاء کے اعتبار سے اُن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان اعضاء کو ہر چہرے پر جس تناسب کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے وہ ہر ایک میں الگ الگ ہے۔ اور یہی تناسب ایک چہرے کو دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ لہٰذا اس فیصلے کا دارومدار کہ کیا انسانیت اسلام کی طرف بڑھ رہی ہے اس بات پر موقوف نہیں کہ اُس نے اسلام کے چند اصولوں کو اپنا لیا ہے، بلکہ اس معاملے میں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا انسانیت نے پورے شعور اور رضا و رغبت کے ساتھ اسلام کے اُس بنیادی تصورِ حیات کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی ہے جس کے مطابق اسلامی نظامِ حیات کے مختلف شعبوں کو مرتب کیا گیا ہے۔ یہی چیز انسانیت کی ترقی اور تکمیل میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسی سے اس بات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانیت فی الواقع اسلام کے کس قدر قریب پہنچی ہے۔